ایک گھرانہ

آسیہ رزاقی

قسط نمبر 1

پرانے زمانے میں اردو ادب کے رسیا، مصنف حضرات اپنے دور کے ہم عصروں کے تذکرے لکھا کرتے تھے۔ پھر پطرس نے دوستوں کے قصے لکھ کر شوق پورا کیا۔ خیر۔ ہم تو ان حضرات کے پیروں کی دھول بھی نہیں ہیں۔ (ادب کے لحاظ سے) مگر شوق لکھنے کا ہے۔ اور چند ایسی نادر و نایاب ہستیوں سے ہمارا واسطہ پڑا۔ کہ ان کے بارے میں کچھ اظہار کرنے کو دل بے چین ہوگیا۔ فکاہیہ ادب، مزاحیہ انداز، ہم اس صنف ادب میں کورے سہی۔ لیکن ـــــ شوق ـــــ بے پایاں۔ ہم اناڑی سہی۔ مگر جن کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں۔ خدشہ ہے کہ ہم سے پہلے کوئی اور نہ ان کو اپنا موضوع بنالے۔ پکل نہ کر جائے۔ ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں کہ یہ کیا ہوا۔ ہم اناڑی ہیں۔ مگر جن پر لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس قابل ضرور ہیں کہ انہیں قلم کی گرفت میں لایا جائے۔ جی ہاں۔ اب ذکر ہو جائے بھانجیوں کا (اور ان کی اولاد کا بھی) کہ خیر سے ہم اس صنف میں خود کفیل ہیں۔ (ماشاءاللہ) اللہ کے فضل و کرم سے سب ایک سے بڑھ کر ایک منفرد کردار ہیں۔ نہ صرف بھانجیوں بلکہ ان کی اولاد کے بھی ہم خالہ جان ہیں۔ خوش قسمتی کہیے۔

بچپن میں بزرگوں کی زبانی کہانیاں سنی تھیں۔ ان کہانیوں میں کوئی جن یا کوئی ظالم دیو بھی ہوتا تھا۔ شہزادی ـــــ جی۔ گم شدہ شہزادی کی تلاش میں آنے والا آدم زاد جب ظالم دیو ـــــ یا جن کو ماموں کہہ کر مخاطب ہوتا۔ دیو بے چارگی سے کہتا۔

"اب تجھے کیا سزا دوں۔ تو تو بھانجا نکلا۔ لے جا اپنی شہزادی۔" یوں شہزادی اس رشتے کے احترام میں واپس اپنے لوگوں میں آجاتی۔ آدم زاد اور دیو کی دشمنی رشتے کے تقدس میں تبدیل ہو جاتی۔ کاش کسی دیو نی نے بھی کہا ہوتا۔ "اے آدم زادی۔ اب تجھے کیا کہوں کہ میں تو تیری خالہ جان ہوں۔" دوستی شروع۔ دوستی تو یوں بھی ہماری سب بھانجیوں سے بہت ہے۔ مگر نہ ہم دیو نی ہیں۔ نہ ـــــ وہ ـــــ وہ تو خیر سب ہماری جیسی آدم زادیاں ہیں۔ مگر سبھی اختلاف اپنی جگہ اور اسی اختلاف کا تقاضا ہے۔ کہ تعارفی مضمون کا عنوان ہونا چاہیے۔ "نادر و نایاب و عجیب" تو شروع کرتے ہیں اللہ کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ (اللہ ہم پر بھی رحم کرے) اس مضمون کے بعد ـــــ جو ہوگا۔ اس کے ذمے دار قارئین ہوں گے کہ انہی کی تفریح طبع اور دلچسپی کے نام ہے یہ مضمون۔ بلکہ معلومات عامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا، چغلی یا غیبت ہرگز نہیں۔ پھر بھی ـــــ اللہ معاف کرے۔

اب ذکر ہو جائے بھانجی نمبر ایک۔ بچپن سے ہی ان کو "گم شدہ" ہو جانے کا شوق ہے۔ عرصہ گزرا۔ ہم ایک جننگ فیکٹری میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں ہمارے میاں صاحب منیجر تھے۔ یہ صاحب اپنی امی کے ساتھ ہم سے ملنے تشریف لائیں۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی کپاس کے ڈھیر پہاڑ کی صورت میں موجود تھے۔ جیسے برف سے ڈھکی پہاڑی۔ یہ صاحب کچھ دیر بعد ہی گھر سے باہر نکل گئیں۔ ہم اپنی بہن سے باتوں میں مگن، کچھ دیر بعد ان کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو تلاش شروع ہوئی، اور ان کی اماں جان کا زار و قطار رونا دھونا۔ ہمارے میاں نے فیکٹری کے ملازمین کو کہا کہ کپاس کے پہاڑ کھود کر بچی برآمد کرو۔ فریاد نے تو پتھر کے پہاڑ کھود کر دودھ برآمد کیا تھا۔ یہ تو نرم نرم روئی کے پہاڑ تھے۔ بے چارے مزدور بیچارے لے کر پہاڑ پر۔ (کپاس کے پہاڑ) چڑھ گئے۔ بچی اس میں ہوتی تو ملتی۔ دو تو کسی برقعہ پوش خاتون کے پیچھے پیچھے گیٹ سے باہر چلی گئی تھی۔ یہ بات تحقیق اور تفتیش کے دوران گیٹ کیپر نے حلیہ یاد آنے پر بتائی۔ چنانچہ فوراً مسجد سے اعلان کروایا گیا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ ایک تانگے والا اعلان سن کر بچی کو لے کر آگیا۔ وہ کافی دیر سے بچی کو لیے پھر رہا تھا۔ اور یہ محترمہ گھوڑے کی سیر مفت میں کرتی رہیں۔ بے حد مسرور، ایک ہاتھ میں برفی کا ٹکڑا، دوسرے ہاتھ میں گڑ کی ڈلی۔ تانگے والے نے خاطر تو خوب کی۔

دوسری بار دودھ والا دودھ دے کر واپس جا رہا تھا۔ یہ محترمہ اس کے پیچھے چل دیں۔ دودھ سائیکل پر بیٹھ یہ جا۔ وہ جا۔ یہ صاحبہ ٹک کی سیدھ میں چلتی گئیں۔ وہ تو شکر ہے کہ دیر نہ ہوئی۔ اور اسی سڑک پر مل گئیں۔

انہوں نے بغور معائنے کے بعد فرمایا۔ "چابی دیں۔" دے دی گئی۔

آگے پولیس۔ پیچھے ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ وہی عام نظارہ جو لاؤنج میں ہم ہر وقت دیکھا کرتے ہیں۔ یعنی کپڑے ہی کپڑے۔ پولیس کے جوان مکمن ہاتھ روم کمرے۔ اوپر جا کر بھی تلاشی لیتے رہے۔ پولیس کے جوان خیر ان بہت اچھے چور اندر نہیں آیا۔ تو پھر۔ یہ شاپرز۔ یہ تھیلیاں۔ صوفوں پر سلے ہوئے تھے کور کپڑے۔ کمرے کے بیڈ پر بھی کپڑے ہی کپڑے۔ آخر کس نے الماریوں سے نکال کر جگہ جگہ جمع کیا۔ اور اگر چوروں نے ہی جمع کیا تھا تو لے کر کیوں نہیں گئے۔ ہم لوگوں نے "چوری نہیں ہوئی" کی یقین دہانی کرا کے شکریہ کے ساتھ ان کو بھیجا۔ مگر بے یقینی حیرانی ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔ انہوں نے ایسا کوئی گھرانہ اب تک کہاں دیکھا ہوگا۔ جہاں کپڑے الماریوں سوٹ کیسوں کے بجائے صوفوں اور میزوں، پلنگوں پر رکھے جاتے ہوں۔

ان محترمہ کو بلند آواز سے بولنے کا بھی شوق ہے۔ ان کو کوئی ذہنی چھپی یا راز کی بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جی ہاں۔ راز، راز نہیں سزا بن سکتا ہے۔ جب بھی وہ اس راز کی بات پر رائے زنی کرنے پر مجبور ہوئیں۔ پورا محلہ اس راز سے واقف ہو سکتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر کے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہی ہوتی ہیں۔ برابر والے گھر میں اسی طرح سنا جاتا ہے گویا ساتھ کے کمرے میں بات ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ان کو کم بولنا اور آہستہ بولنا چاہیے۔ ورنہ مستقل گلے کی خرابی کا شکار ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اس قسم کی گلے کی خرابی کا شکار زیادہ گانے والے گلوکار ہوتے ہیں۔ "آپ بھی کم گایا کریں۔" ان کے بیٹے کو سکول میں جملے بنانے کے لئے ایک لفظ دیا گیا۔ بلند پایہ۔ اس نے جملہ لکھا۔ "میری اماں کی آواز بہت بلند پایہ ہے۔" ان کے صاحبزادے کو اچانک ہی موسیقی کا شوق ہوا۔ گٹار بھی لے لیا۔ اب ان کے کمرے سے کبھی مغربی موسیقی کی تیز پکار۔ کبھی کلاسیکل راگوں کی سُریلی تانوں کی آوازیں آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو جگ دھمال۔ شمشیر و سنان کی جھنکاریں۔ کبھی دردانگیز فریادیں اور کبھی غصیلی چنگھاڑیں بھی سُنی جا سکتی ہیں۔ ایک بار تو ہم ڈر گئے کہ نہ جانے کمرے میں کس سے کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ یا کے بازی کے دور چل رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ "بیٹا پریکٹس کر رہا ہے۔ لمبس میں میوزک شو ہونے والا ہے۔ اس کے مقابلے کی تیاری ہو رہی ہے۔" نتیجہ یہ کہ مغربی موسیقی کے مقابلے میں فرسٹ آئے۔ کلاسیکل میں بہترین گلوکار کا ایوارڈ ملا۔ پھر وہ او لیول کے امتحان کی تیاری میں شد و مد سے بجٹ گئے۔ بند کمرے سے گٹار کے ساتھ دھینگا مشتی۔ چیخیں۔ ہائے ہو کی دہائیں۔ اور باہر سے والدہ محترمہ کی پکاریں۔ "پڑھ لے۔ ارے کبھی کچھ پڑھ بھی لینا چاہیے۔ نمبر کم آئے۔ تو میرے ہاتھ سے بہت پٹے گا۔" اور کبھی تو ایسی چند گالیوں سے بیٹے کو نوازا جاتا جیسے صاحبزادے کسی الو یا گدھے کے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ گالیوں سے منع کرنے پر عذر پیش کریں۔ "پڑھتا ہی نہیں۔"

"نماز تو پڑھتا ہے۔" نانی فوراً گواہی دیتیں۔ (جائے نماز انہی سے تو مانگتا تھا۔) ان صاحب کی ایک بڑی بہن بھی ہیں۔ بے حد معصوم طبیعت۔ نرم دل۔ بلیاں گھر میں قحط کر دودھ چٹ کر جائیں یا گوشت کھا جائیں۔ مارنا بھگانا درکنار روکتی بھی نہیں۔ بیچ رحمدل، وہ، (بے چاری بھوکی ہیں) مسئلہ یہ ہے کہ اماں نے بلیوں کا راشن مقرر کیا ہے۔ بازار سے روزانہ مرغی والے سے مرغی کی سریاں (مرغیوں کے سر) خرید لاتی ہیں۔ پورچ میں برتن میں ڈال کر آواز دی جاتی ہے۔ "ماؤ" تو جی بلی حاضر۔ محلے بھر کی بلیاں اس دعوت شیراز کا لطف لیتی ہیں۔ پالتو بلی۔ یا کوئی کمزور بلی بھوکی رہ جائے تو وہ بے لطف ڈبے سے اتر کر کچن کی راہ لے گی۔ سامنے رکھا ہوا دودھ۔ سالن۔ کباب۔ جوٹے۔ ہضم۔

بلی کھانا کھاتی ہے۔ محترمہ جنی سے ڈائنٹ۔ ایک زمانے میں یہ صرف پیٹ شرٹ پہنا کرتی تھیں (بچپن میں) ہم نے ان کو دوپٹے کے تھے دینے شروع کئے۔ کبھی کراچی سے پیاری سی چنری، کبھی دوپٹہ۔ پوچھنے لگیں۔ "خالہ جان۔ آپ ہر مرتبہ مجھے دوپٹہ ہی کیوں دیتی ہیں؟" (ہائے معصومیت) ہم نے کہا۔ "اس لئے کہ تمہیں عادت ہو جائے۔ دوپٹہ حیا کی علامت ہے۔" نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ اب بہت قرینے طریقے سے دوپٹہ سر سے اوڑھتی ہیں۔ چنانچہ۔ موٹاپے کے تدارک کے لئے ماڈل ٹاؤن پارک میں جاگنگ شروع کی۔ کھانے پینے میں احتیاط۔ صرف ابلی ہوئی دال مونگ۔ کچی سبزیاں اور قہوہ ان کی خوراک تھا۔ جم جوائن کر لیا۔ ہفتوں سلسلہ رہا۔ سب منع کرتے رہے مگر۔ انہیں اپنے "پتلی" ہونے کا احساس تھی ہوا۔ جب نقاہت سے لڑکھڑانے لگیں۔ اب وہ کچھ سمجھدار ہو چکی ہیں۔ ایک مشہور سکول میں ٹیچر ہیں۔ ان محترمہ کے بھی نہیں دن بھائی کی طرح دو بچے ہیں۔ بیٹی۔ بیٹا۔ بیٹی بہت چھوٹی تھی۔ اسی وقت سے اسے زبان سے نکلے کسی بھی لفظ کو فوراً پورا کروانے کا شوق تھا۔ ایک بار یہ بچی اپنے والدین اور دادا دادی کے ہمراہ کھاریاں سے لاہور آرہی تھی۔ بوریت۔ سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے۔ لہٰذا۔ ان کے منہ سے نکلا۔ "آلو کھانا ہے۔" اماں نے دادی نے پیار کیا۔ "اچھا بیٹا۔ لاہور جا کر کھا لینا۔" بڑے لوگ پھر باتوں میں مگن ہو گئے۔ پانچ منٹ بعد پھر منہ سے نکلا۔ "آلو کھانا ہے۔" چپس کے پیکٹ نکالے۔ کھولنے دیئے۔ مگر۔ آلو کھانے کی خواہش شدید ہو گئی۔ جوس پلایا۔ بسکٹ کھلائے۔ لیکن ہر پانچ منٹ پر "آلو کھانا ہے" کا ریکارڈ بجتا رہا۔ بجتا ہی رہا۔ بارے لاہور پہنچے۔ گاڑی رکتے ہی بچی کے دادا نے اسے گود میں اٹھایا۔ گھر کی تاکید کی۔ گھر کے دوپٹے کی گیند بنا کر بغل میں دبا کر اپنی دانست میں چھپا لے جاتی تھیں۔ (سب کے سامنے دوپٹہ اوڑھنے میں شرم آتی تھی) ایک بار ان کی والدہ کو ان سے ہمدردی ہوئی۔ بے چاری پڑھائی کر رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کے لئے بھی چائے بنالی۔ اور لا کر دی۔ اپنی چائے لے کر وہ اوپر کے کمرے میں چلی گئیں۔ یہ صاحبہ بھی اپنا مگ لے پیچھے پیچھے وہیں پہنچیں۔ "ماما۔ ہم پوچھ رہے ہیں آپ نے ہماری چائے میں پتی ڈالی کہ نہیں۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔ اور آگئیں۔"

ماما نے گھورا۔ "تو کچھ لیتیں۔" مگر خیر یہ تو بات پرانی ہوگئی۔ اب انہیں اچانک خیال آیا کہ وہ چپل رہی ہیں۔ چنانچہ۔ موٹاپے کے تدارک کے لئے ماڈل ٹاؤن پارک میں جاگنگ شروع کی۔ کھانے پینے میں احتیاط۔ صرف ابلی ہوئی دال مونگ۔ کچی سبزیاں اور قہوہ ان کی خوراک تھا۔ جم جوائن کر لیا۔ ہفتوں سلسلہ رہا۔ سب منع کرتے رہے مگر۔ انہیں اپنے "پتلی" ہونے کا احساس تھی ہوا۔ جب نقاہت سے لڑکھڑانے لگیں۔ اب وہ کچھ سمجھدار ہو چکی ہیں۔ ایک مشہور سکول میں ٹیچر ہیں۔ ان محترمہ کے بھی نہیں دن بھائی کی طرح دو بچے ہیں۔ بیٹی۔ بیٹا۔ بیٹی بہت چھوٹی تھی۔ اسی وقت سے اسے زبان سے نکلے کسی بھی لفظ کو فوراً پورا کروانے کا شوق تھا۔ ایک بار یہ بچی اپنے والدین اور دادا دادی کے ہمراہ کھاریاں سے لاہور آرہی تھی۔ بوریت۔ سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے۔ لہٰذا۔ ان کے منہ سے نکلا۔ "آلو کھانا ہے۔" اماں نے دادی نے پیار کیا۔ "اچھا بیٹا۔ لاہور جا کر کھا لینا۔" بڑے لوگ پھر باتوں میں مگن ہو گئے۔ پانچ منٹ بعد پھر منہ سے نکلا۔ "آلو کھانا ہے۔" چپس کے پیکٹ نکالے۔ کھولنے دیئے۔ مگر۔ آلو کھانے کی خواہش شدید ہو گئی۔ جوس پلایا۔ بسکٹ کھلائے۔ لیکن ہر پانچ منٹ پر "آلو کھانا ہے" کا ریکارڈ بجتا رہا۔ بجتا ہی رہا۔ بارے لاہور پہنچے۔ گاڑی رکتے ہی بچی کے دادا نے اسے گود میں اٹھایا۔ گھر میں آئے۔ بچی کی گود میں اسے چپا اور زور سے بولے۔ "خدا کے لئے اپنی خواہی کو آلو کھلا دو۔"

ان کے کان کم سنی میں ہی مارے شوق کے چھدوا دیئے گئے۔ بالیاں پہنا دیں۔ مگر اسکولنگ کے وقت بالیاں اتار دی گئیں۔ کچھ عرصے بعد اماں اور نانی کو احساس ہوا کہ بچی کے کانوں کے سوراخ بند ہو گئے ہیں یا عنقریب ہونے والے ہیں۔ قریبی عزیز کی شادی اگلے ماہ ہے۔ کیا بچی بھی کانوں کے ساتھ شریک ہوگی؟ چنانچہ لبرٹی میں ایک "لغیر دوکان چھدوائیے۔" کے بورڈ دیکھ کر دونوں ماں بیٹیاں بچی کو وہاں لے آئیں اور سوراخ کرنے والے "ڈاکٹر" کو صورت حال بتائی۔ اس نے کہا۔ "کوئی مسئلہ نہیں" اور سوراخ کرنے والے پستول کو اٹھایا۔ بچی کھڑی ہو گئی۔ خوفزدہ۔ زبردستی پکڑ دھکڑ کر اماں اور نانی نے بٹھایا۔ بچی زیادہ زور آور تھی۔ کسی طرح قابو میں نہ آئے۔ اماں نانی اور ڈاکٹر برابر زور لگا رہے ہیں۔ بچی میں "جن" کی طاقت آگئی تھی کہ کسی طور قابو میں نہ آئی۔ اماں کا اسکارف سر سے کھسک گیا۔ بال بکھر گئے۔ نانی ہانپ گئیں۔ تماشا دیکھنے والوں کا ٹھٹھ جمع ہو گیا۔ (مفت کی ریسلنگ) "ہائے۔ بچی تڑپ رہی ہے آپا جی۔ رحم کرو اس پر۔"

"کیوں تکلیف دیتے ہو بچی۔ جانے دو۔ کان چھدوانے کی جلدی کیا ہے۔ ابھی چھوٹی ہے۔" تماش بین خواتین کے مشورے۔ پستول والا بھی شاید ڈر گیا۔ "چھوڑیں آپا جی۔"

اب یہ انا کا سوال تھا۔ ضد کا معاملہ۔ تماش بین عورتوں سے شرمندگی۔ ہار نے کی ذلت۔ ازسرنو نانی نے اسے باہوں میں جکڑا۔ اماں نے پیر پکڑے۔ بارے پستول نے کام دکھایا۔ مگر۔ ایک کان کا سوراخ ہی ممکن ہوا۔ ایک لمحہ۔ ڈیڑھ گھنٹے پر محیط ہوا۔ رات کو نانی بازو دباتی رہیں۔ "نہ جانے کیا ہوا ہے۔ اتنا درد میرے بازو میں کبھی نہیں ہوا۔ ماسی نے دباتے ہوئے انکشاف کیا۔ ہولناک انکشاف۔

"باجی آپ کے بازو میں تو "کھلیاں" پڑ گئی ہیں۔" بہت غور پر بھی یاد نہ آیا کہ آج کونسا بھاری کام کیا ہے۔ بچی نے راز پر سے پردہ اٹھایا۔ "ماما۔ آپ نے مٹی کے کان چھیدتے ہوئے زور کتنا لگایا تھا۔ پکڑم پکڑائی کی وجہ سے۔"

علی صاحب کو بھی گم شدہ ہونے کا اتفاق ہوا۔ ہر سمت تلاش شروع ہوئی۔ دو گھنٹے بعد ایک لڑکا کندھے پر بٹھائے بآواز بلند ہر کسی سے پوچھتا پھر رہا تھا۔ "یہ بچی کس کی ہے؟" خوش قسمتی سے درزی نے دیکھا۔ اور بتایا۔ "یہ ہماری میڈم کی رشتے دار بچی ہے۔" سب نے شکھ کا سانس لیا۔ ذرا بڑی ہوئیں تو دوست بنانے کا شوق ہوا۔ جس لڑکی کو بیسٹ فرینڈ کا درجہ دیتی ہیں۔ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتی ہیں۔ کوئی پوچھ لے۔ "بیسٹ فرینڈ کا نام کیا ہے؟" کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کرتی ہیں۔ یعنی۔ نام۔ نامعلوم۔ (دوستی کے لئے شاید نام کی اہمیت نہیں) ان کا چھوٹا بھائی بھی ہے۔ مگر۔ بہت سادہ۔ نمازی۔ (دستار کا پابند۔ فوجی کا بیٹا ہے آخر۔

اب جگر تھام کر بیٹھو۔ بھانجی نمبر 3 کی باری آئی۔ یہ محترمہ گوناگوں خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان

کے لئے ہمارا تجویز کردہ عنوان عملی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ یعنی۔ نادر و نایاب و عجیب۔

ذہین۔ سمجھدار۔ دور کی کوڑی لانے والی۔ (ان کے اپنے بارے میں ان کے خیال میں) بہت زیادہ بولنے کا شوق ہے۔ بہت اونچی آواز میں رائے زنی کا شوق ہے۔ (اپنی کزن۔ بھانجی نمبر 1 کے مانند) اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں (جس کے استعمال کی نوبت کم کم آتی ہے۔) بچوں کی تربیت کا منفرد انداز اختیار کرتی ہیں۔ بچے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کی عادت ہے۔ اسی حالت میں تربیت شروع۔ غل آواز میں بچوں کو ہدایتیں۔ نصیحتیں۔ غصہ۔ گرمی۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ وہاں نہ جاؤ۔ پردہ چھوڑو۔ پھٹ جائے گا۔ پلگ کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ٹی وی کیوں کھولا۔ ہوم ورک کرو۔ میز پر نہ چڑھو۔ شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ چھپے گا۔ خون نکلے گا۔ پھر انجکشن لگے گا۔ سب کچھ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے ہدایتیں جاری رہتی ہیں۔ خواہ بچہ کسی خطرے سے دوچار ہونے والا ہو۔ اٹھ کر ہاتھ پکڑ کر روکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب آواز و ہنگ ہے۔ پکڑ تو جاتا ہی ہے۔ مگر۔ یہ ان کی خام خیالی ہے۔ بچے۔ جو کر رہا ہے۔ کرتا رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے۔ ماں اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں۔ اس لئے وہ چیخ پکار کی پروا کئے بغیر اپنے شغل میں لگا رہے گا۔ یہ اپنا کام کرتی رہیں گی۔ چیخے چلانے کا۔

(جاری ہے)

ایک گھرانہ

آسیہ رزاقی

آخری قسط

اپنے گھر مہمان بلانے کا بہت شوق ہے۔ ایک بار ہمیں مہمان بنانے میں کامیاب ہوگئیں۔ خالہ جان بہت سارے کپڑے لے کر چلیں۔ سب رشتے داروں سے ملوانے لے جائینگے۔ کراچی کی سیر کرائیں گے سمندر کی سیر وادی انہوں نے لالچ دیا۔

''تمہارے گھر میں تو دو بڈھے ہیں۔ ایک تمہارا ایک بچوں کا۔ ہمیں کیا زمین پر سلاؤ گی۔''

''آپ حامی بھریں سب کچھ ہو جائے گا۔'' سیر تفریح ہوٹنگ وغیرہ (لانچ) سیر و تفریح کا ہمیں زیادہ شوق نہیں۔ کیونکہ کراچی میں تو لے دے کے ایک سمندر ہی ہے۔ لاہور میں تو بے شمار تفریح گاہیں موجود ہیں۔ کامران کی بارہ دری' شالیمار باغ' مقبرہ جہانگیر' مینار پاکستان' قلعہ شاہی' شاہی مسجد' نور جہاں کا مقبرہ' شلمہ پہاڑی' باغ جناح' گلستان فاطمہ' گلشن اقبال' ریس کورس پارک' ماڈل ٹاؤن پارک۔ کئی دن بعد وہ آ کر زبردستی ہمیں گلشن سے اپنے گھر لے گئیں۔ معہ ہمارے بہت سے کپڑوں کے۔ جا کر دیکھا ایک نیا بیڈ بھی موجود ہے۔ یہ کہاں سے آیا؟

''میاں کے کان کھانے کہ خالہ جان کا ایک الگ بیڈ چاہیے۔'' (واقعی کان کھائے ہوگے)

وہ تو کچن میں مصروف ہوگئیں۔ ہم بچوں کے ساتھ ٹی وی میں مشغول ہوگئے۔ بچوں کی فرمائش پر کارٹون دیکھے۔ خوفناک ریسلنگ دیکھی۔ پھر ملازمہ لڑکی نے آ کر کہا ''باجی آپ کے لئے کھانا لگادوں۔ باجی کہیں چلی گئی ہیں۔'' ہم نے بچوں کے ساتھ کھانا کھالیا۔

ان کی بیٹی دیر تک آم کے اچار سے پنجارے لیتی گئی۔

رات کو اچار نہیں کھانا چاہیے۔ گلا خراب ہو جاتا ہے بچوں کو تو بالکل کھٹی مسالے کی تیل والی چیزیں ہرگز نہیں کھانا چاہیں۔ نقصان دہ ہیں۔ وہ تلملا چپ ہوگئی۔ اب پھر ٹی وی اور ہم اور بچے مووی ہوگئی تو ہم بچوں کی فرمائش پر ان کے بیڈ پر ہی لیٹ گئے۔ کہانیاں سنانی شروع کیں۔ ایک کے بعد ایک ختم ہوتی تو اگلی کی فرمائش۔ ہم تینوں ایک بیڈ پر سو گئے۔ نیا بیڈ نیا ہی رہا۔

صبح سویرے وہ بچوں کو سکول لے کر گئیں۔ سکول سے ہی انہیں کسی کو کہیں پر لے کر جانا تھا۔ انہوں نے اس طرح کی ڈیوٹی خود لی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرے شہر یا دوسرے ملک سے آ رہا ہے۔ کوئی بھی عزیز اسے لینے ائرپورٹ جائیں گے۔ کہیں جانے والے کو ائرپورٹ یا سٹیشن پہنچانے جائیں گی۔ خیر وہ پیر کو بچوں کو سکول سے لیتے ہوئے گھر آئیں۔ بستر پر گر کر خرخر کی موسیقی شروع۔ سہ پہر کو اٹھ کر نہا دھو کر تیار ہو کر کمرے سے نکلیں۔ دائیں ہاتھ کی پڑوسن آ گئی تھی۔ اسے لے کر شاپنگ کے لئے چلی گئیں۔ رات کو تشریف لائیں۔ افراتفری میں کھانا کھایا اور سامنے والی بلڈنگ میں جانے کی خبر دے کر روانہ ہوئیں۔ سامنے والی بلڈنگ میں ان کی ساس سسر رہتے ہیں۔ دن بھر اتنی مصروفیت رہی کہ ان کی خیریت کو جا نہ سکی تھیں۔ رات ایک بجے ان کی واپسی ہوئی۔ ہم بچوں کو کہانیاں سناسنا کر انہیں سلا چکے تھے۔

اگلا دن طلوع ہوا تو شتے پر ہی آج کا پروگرام نشر کیا۔ کھانا تیار کر کے بائیں ہاتھ والی پڑوسن کے ساتھ شاپنگ پر جانا ہے۔ کل آپ نے دائیں ہاتھ والی پڑوسن کو دیکھ لیا تھا اب اس کے ساتھ ہم نہ گئے تو برا مانے گی۔ اس کے بھائی کی شادی ہونے والی ہے۔ شام کو باسکل جانا ہے جہاں تند صاحبہ داخل ہیں۔ اگر رات کو آ کر رہنے کیلئے کوئی باسکل نہ آیا تو ہمیں قیام کرنا ہوگا۔ مجبوری ہے فکر نہ کریں ہم صبح دس بجے تک آ جائینگے۔ پھر آپ کو لے چلیں گے۔

ہم نے کہا ''تم ہمیں گلشن ہی پہنچا دو۔''

بہت برا مانیں۔ ''اے بیٹے بہن کے گھر بہت دل لگتا ہے بھانجی کیا چٹکیاں کاٹتی ہے کہ دو دن میں اکتا گئیں۔'' یہ سنا تو راضی ہوگئیں۔ بچے میاں کے ساتھ سکول روانہ کر چکی تھیں۔ جلدی جلدی کچھ پکا کر بائیں ہاتھ والی پڑوسن کے آنے پر روانگی عمل میں آئی۔ ہم نے اپنے وہ بہت سارے کپڑے (فرمائشی) اٹھائے اور ان کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ (وہی کپڑے جو بہت سے عزیزوں سے ملنے ان کے گھر پہن کر جاتے تھے) راستے سے انہوں نے بچوں کو سکول سے لیا ایک پٹرول پمپ پر رک کر پٹرول ڈلوایا پھر اتر کر موبائل کارڈ لینے سٹور میں گھس گئیں۔ بچی بھی چلی گئی۔ آئی تو چند پیکٹ چیونگم کے ہاتھ میں تھے۔ ببل گم منہ میں تھا چیونگم بھائی کو بھی دیئے اور ہماری خاطر بھی کی۔

ہم نے اسے سمجھایا ''یہ تو بہت گندی چیز ہوتی ہے۔ تم نہ کھایا کرو نہ بھائی کو دیا کرو۔ آنتوں میں چپک کر بیمار بھی کر سکتی ہے۔ تمہاری ماما منع نہیں کرتی۔ بچی نے انکار میں گردن ہلائی، بولی خالہ جان آپ تہ کے گھر کب جائیں گی؟''

بچے ہمارے دور کے چالاک ہوگئے۔ پروین شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم کلفٹن آ گئے۔

اگلی صبح بچوں کو سکول چھوڑ کر سیدھی ہمارے پاس آئیں بھانجی صاحب۔ ''خالہ جان جلدی سے ہمارے ساتھ چلیں بولٹن مارکیٹ جانا ہے۔''

مختصراً بتایا کہ بولٹن مارکیٹ میں ایک دکاندار فون پر آرڈر لے کر مطلوبہ اشیاء گھر پر پہنچا دیتا ہے۔ ہم نے منگوائے تھے۔ وہ دے کر چلا گیا اب جو ہم نے دیکھا تو وہ چھوٹے سائز کے تھے۔ فون کیا کہ بھئی یہ تو چھوٹے سائز کے ہیں بڑے سائز کے لا کر دو اور چھوٹے لے جاؤ۔ کمبخت نے کہا کہ آپ خود آ کر دے جائیں اور مرضی کے لے جائیں یا کسی کے ہاتھ بھیج دیں۔ اب ہمیں جانا تو پڑیگا مگر ہم کبھی بولٹن مارکیٹ گئے نہیں۔ (تعجب ہوا کوئی مارکیٹ ایسی بھی ہے جو ان کے دیدار سے محروم ہے) ہم نے صاف انکار کر دیا۔ تہ کو لے کر گئیں۔

اب تہ کی زبانی احوال سنئے۔ بولٹن مارکیٹ پہنچنے تک گاڑی کا شیشہ بار بار اتار کر ہر کسی بلکہ ہر کس و ناکس سے ''بھائی بولٹن مارکیٹ کہاں پر ہے'' کا سوال کرتی رہیں۔ بولٹن مارکیٹ پہنچ کر گاڑی سائیڈ پر کھڑی کی۔ گلی میں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ گلی میں یعنی بولٹن مارکیٹ میں داخل ہوئے۔ پہلی دکان پر ایک مزدور دکان کی سیڑھی مرمت کر رہا تھا۔ انہوں نے رک کر اس مزدور سے پوچھا ''بھائی منیر کی دکان کہاں پر ہے؟'' مزدور نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ آگے بڑھے تو ایک ہاتھ ریڑھی والا بوڑھا بابا ملا۔ اس کی ریڑھی پر کپڑوں کے بہت سے بنڈل لدے ہوئے تھے۔ اس سے بھی پوچھ لیا کہ ''بھائی جان منیر کی دکان کہاں پر ہے؟'' بیچارا بمشکل ریڑھی چلا رہا تھا۔ بوجھ کی وجہ سے رکنا پڑا۔ پسینہ پونچھ کر بولا ''آگے دیکھ لو۔'' آگے ایک دکان کپڑے کی تھی۔ کافی خواتین کا رش تھا۔ اس کے اندر جھانک کر انہوں نے سیلز مین سے بھی سوال کیا۔ ''بھائی صاحب منیر کی دکان کہاں ہے؟'' اس نے لاپرواہی سے گردن ہلا دی۔ بولا پتہ نہیں جی۔ اور پھر مصروف ہوگیا۔ آگے ایک بوڑھا بیٹھی لکڑی کا کوئی کام کر رہا تھا۔ اس سے بولیں۔ ''بھائی جی منیر کی دکان کہاں ہے؟'' وہ کچھ حیران ہوا۔ (بابا، چاچا، یا لالہ کے بجائے ایک جوان لڑکی نے بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ شاید اس عمر میں پہلی بار)

ہم نے ان کو ٹوکا۔ ''آگے چلو۔ مل جائے گی دکان۔ ڈھونڈ ہی لیں گے خود۔''

''اے بیٹے۔ لو۔ پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ذرا جلدی پہنچ جاتے۔'' (نیا نسخہ ہے۔ نوٹ فرما لیں) کچھ آگے جا کر دکان نظر آئی۔ سیلز مین کو پہچان کر اندر گھسیں اور شکوہ کیا۔ کہ اتنی دور اندر جا کر دکان لینے کی کیا ضرورت تھی۔ پوچھ پوچھ کر اتنی مشکل سے پہنچے ہیں۔ خیر منیر واپس کئے۔ دوسرے لئے اور واپسی ہوئی۔ سب سے پہلے بوڑھا بھنگی ملا۔ بڑے اشتیاق سے پوچھنے لگا۔ ''باجی جی منیر کی دکان مل گئی؟''

''اے بیٹے۔ اس بڈھے کی حالت دیکھیں شرم نہیں آئی۔ ہمیں باجی کہہ رہا ہے۔'' کپڑے کی دکان والا بھی اب فارغ تھا۔ اندر سے ہی پکارا۔ ''باجی! منیر کی دکان ملی؟'' ہتھ ریڑھی والا بڑبڑاتا اتار کر سستا رہا تھا۔ پوچھنے لگا ''آپا جی منیر کی دکان مل گئی؟''

''توبہ۔ تہ کتنے لیجنڈ لوگ ہیں۔ ہر کسی کو ہماری فکر ہے۔ ہاں بابا مل گئی۔۔۔''

گلی سے باہر نکلے مزدور ابھی سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ بڑے شوق سے سندھی ٹوپی اتار کر جھاڑ کر بولا ''او منیر کی دکان مل گئی؟''

''ہاں بابا! مل گئی، مل گئی یہ رہے منیر۔ پہنو گے؟'' کہہ کر جلدی سے باہر آ گئیں کہ کہیں وہ مانگ ہی نہ لے۔ اب راستے بھر تہ کی ڈانٹ سنتی رہیں اور وہ اکڑ سنتی ہی ہیں۔ کسی نہ کسی معاملے پر۔ ان کی شاپنگ کا قاعدہ یہی ہے کہ سارا بازار انہیں جان لے۔ واقف ہو جائے۔ کہ یہ آج شاپنگ کے لئے آئی ہیں۔ ایک بار لاہور آئی تھیں۔ حسب معمول شاہ عالم مارکیٹ کے دورے پر گئیں۔ وہاں گاڑی کی پارکنگ نہیں ہے۔ ایک پلازے کی غالباً چوتھی منزل پر پارکنگ ہے۔ گاڑی اوپر چڑھا کر لے گئیں۔ پھر وہاں سے سیڑھیوں سے اتر کر مارکیٹ آئیں۔ خریداری ہوگئی۔ تو فٹ پاتھ پر ایک پٹھان چپلیں فروخت کر رہا تھا۔ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ کئی چپلیں پہن پہن کر دیکھیں۔ پھر واپس زینہ چڑھ کر اوپر پہنچیں۔ گاڑی نیچے اتاری اور روانہ۔ اگلے دن دوڑی دوڑی ہمارے پاس آئیں۔ ''خالہ جان! بھیا کہاں ہیں۔ ان سے بہت ضروری کام ہے۔''

معلوم ہوا۔ کل پٹھان کی دکان پر جو چپلیں پہن کر دیکھی تھیں۔ اپنی اتار کر جلدی میں بغیر دیکھے واپس آ گئیں۔ گھر آ کر دیکھا۔ وہ ایک پیر میں پٹھان کی پرانی چپل پہن آئی ہیں۔ اپنی وہیں رہ گئی۔ اب جا کر پٹھان کی چپل دے کر ہماری لے آئیں۔ خان کی چپل کے ساتھ نمونے کے طور پر اپنی بھی رکھ دی ہے۔ شکل ملا کر لے آئیں۔ رات بھر فکر رہی کہ وہ خان ہماری چپل پہن کر گیا ہوگا تو اس نازک اندام کے بخیے ادھڑ چکے ہوں گے۔ (چپل کے) ہمارے ہمارے بچے (کہ وہ بھی شاہ عالمی کے پرستاروں میں ہیں ہر دکان ہر فٹ پاتھ کی چھوٹی بڑی چیزوں سے خوب واقف۔ یعنی وہ بھی اس دشت کے مصروف سیاح ٹھہرے) ان کی چپل لے آئے، خان کی چپل واپس کر کے۔ ''پٹھان بہت ہنس رہا تھا اس واردات پر۔'' انہوں نے بتایا (بھئی ہنستا نہ تو کیا روتا۔ اس کی سنڈی پٹاخہ ری چپل نے مفت میں کار کی سیر کی) وہ بھی شاہ عالمی کی تنگ گلی سے ماڈل ٹاؤن۔

ایک بار ہم نے ان کے لئے بہت خوبصورت پرنٹ کا سیاہ رنگ کا سوٹ لیا۔ ان کی بہن یعنی بھانجی نمبر 2 کا آتشی گلابی رنگ کا پرنٹ تھا۔ دیکھتے ہی بھڑک گئیں۔

''اچھا۔۔۔ ان کے لئے گلابی۔ ہمارا سیاہ، یہ فرق کیوں؟''

ہم نے سادگی سے کہہ دیا۔ ''ان کا رنگ گورا ہے۔ گلابی اچھا لگے گا ان پر۔''

اوہو۔ تلملا گئیں۔ چراغ پا ہو کر بولیں۔ ''ہاں جی۔ وہ تو گوری ہیں۔ ہم تو کالے ہیں۔ اس لئے ہمارا سوٹ کالا ہے۔ اور وہ جو گوری ہیں۔ وہ اس وجہ سے گوری ہیں کہ اے سی کمرے میں آرام سے رہتی ہیں۔''

''وہ سکول میں دماغ کھپاتی ہیں۔ بچوں پر محنت کرتی ہیں۔ صبح گھر سے نکلتی شام کو آتی ہیں۔ آرام نہ کریں؟'' ہم نے صفائی پیش کی۔ جو نہیں پسند نہ آئی۔ ''جی۔ اے سی والے کمرے میں پڑھاتی ہیں۔ انہیں بچن میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ انہیں پکا پکایا مل جاتا ہے۔ ہر کام ریٹ مین کر لیتا ہے۔ انہیں بازاروں کے چکر نہیں لگانے پڑتے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ان کے بچوں کے بلیان الٹرا ویئر تک ہم بازار سے خریدیں۔ ان کے سوٹ درزی کو دے کر سلوا کر بھیجیں۔ تو ہم تو کالے ہوں گے ہی۔۔۔ اچھا خالہ جان۔ کل ہم شاپنگ پنک سوٹ پہن کر آئیں گے۔ پھر فیصلہ ہوگا۔'' اُف دھواں دھار تقریر۔ جیسے اسمبلی میں کوئی اپوزیشن لیڈر جوش میں آ کر خطابت کے جوہر دکھاتا ہے۔

''بھئی۔ اب تمہیں بازاروں میں پھرنے کا شوق ہے۔ پڑوسنوں کو لئے پھرتی ہو۔'' ہم نے بھی جلے پھپھولے پھوڑے۔ مگر اگلے دن آتشی گلابی سوٹ پہنے۔ بجلی گراتی پھر رہی تھیں۔ اب انصاف کا تقاضا تھا کہ کھلے دل سے اعتراف کر لیا جائے۔ ''ہاں بھئی۔ تم واقعی صاف رنگت کی ہو۔ گلابی گلابی۔ خوش؟ مگر بڑی بہن سے کچھ سیکھ لو۔ جاگنگ کرو۔ جم جوائن کر لو۔ تن و توش کو بڑھنے سے روکنے کے لئے کھانے پینے میں احتیاط کرو۔ تھوڑے دن بعد توپ بن جاؤ گی۔''

''ہائے۔ ہم کھاتے ہی کیا ہیں؟'' تینوں بھانجیوں میں کافی اتحاد ہے۔ تینوں کی دو دو اولادیں ہیں۔ بیٹی۔ بیٹا۔ تینوں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ تو چوتھا بندہ نظر نہیں آتا۔ اپنی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں زور و شور سے۔ ایک جگہ دعوت میں گئیں۔ میزبان بیچارے گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے رہے۔ یہ تینوں گفتگو کا سیلاب بہاتی رہیں۔ آپس میں ہی۔

نمبر 3 کی بیٹی بیٹے بھی ماں سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ بیٹھ کر سوالات کرنے کا شوق ہے۔ انہوں نے ایک صاحب سے سوال کیا۔ ''انکل آپ کی کیا عمر ہے؟

ان صاحب نے بتایا۔ ''میں ستر سال کا ہوں۔''

فوراً بولیں۔ ''اچھا۔ پھر تو آپ میری ایج کے ہوئے۔ میں بھی سیونٹی کی ہوں۔''

ان صاحب نے کچھ حیرت سے انہیں دیکھا۔ تو کہنے لگیں۔ ''بس یہ ہے کہ میں اپنا بہت خیال رکھتی ہوں۔ اس لئے پتہ نہیں چلتا۔''

انہوں نے فرمایا۔ ''بھئی۔ کیا چیز ہو تم۔''

''انکل میں چیز نہیں ہوں۔ بہت شریف لڑکی ہوں۔ آپ میرے گھر آ کر دیکھیں۔ میں ہر وقت سفید ساڑی پہنے پوچا کرتی رہتی ہوں۔''

(ہائے یہ انڈین ڈرامے) ہماری ایک خالہ ہیں۔ انہوں نے چنڈی سے فون کیا۔ صاحبزادی نے فون ریسیو کیا۔ پوچھا آپ کون بول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ تمہاری ماما کی ہائی کی بہن ہوں۔'' حیرت سے بولیں۔ ''ارے۔ آپ ابھی زندہ ہیں۔''

نمبر 4 بھانجی۔ کراچی کلفٹن کی رہائشی۔ اردو ان کی کچھ کمزور ہے۔ گو کہ کراچی اردو بولنے والوں کا شہر مشہور ہے۔ لیکن انگریزی ذریعہ تعلیم نے اردو کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پھر بھی لاہور نے اردو کو سنبھالا ہوا ہے۔ ورنہ پاکستان میں اردو کو پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا۔ یوں بھی ارباب اختیار صاحبان اردو کو صرف رابطے کی زبان قرار دے کر ذریعہ تعلیم صوبائی زبان کو بہتر سمجھتے ہیں۔ گویا ملک میں چار صوبے ہیں تو چار زبانوں کو ترقی دے کر ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اچھا۔ پھر اردو کا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ وہ جو ہر صوبے میں بھی جاتی ہے۔ بلکہ دوسرے ممالک کے لئے بھی اجنبی نہیں رہی۔

بازار میں گداگری کے خلاف اعلانات ہو رہے تھے۔ اعلان کرنے والے نے کسی گداگر کو دیکھ کر گرفتار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

بھانجی نمبر 4 پریشان ہوگئیں۔ ''کہاں۔ تو پھر یہ بیچارے کام کیسے کریں گے؟ جن کے پاس گدھا گاڑی ہے۔ وہ اسی کے ذریعے کمائی کرتے ہیں۔ پھر گدھا گاڑی کا کیا ہوگا؟''

کوئی بچی کوئی اچھا کام کرے۔ کچھ پکائے۔ یا سلائی کڑھائی کر کے دکھائے۔ ہم اسے فوراً انعام سے نوازتے ہیں۔ دس روپے انعام۔ کبھی کبھی تو یہ انعام محض زبانی اعلان پر منحصر ہوتا ہے۔ بچیاں تعریف سن کر ہی خوش ہو جاتی ہیں۔ ان کو بھی ہم نے چنے کی دال کا حلوہ بنا کر کھلانے پر تھرپلا کیا۔ دس روپے انعام۔ بولیں۔ ''لیجئے۔ دس روپے میں کیا ہوتا ہے۔'' ہم نے شرمندہ ہو کر رقم بڑھا دی۔ پچیس روپے انعام۔ بولیں۔ ''پچیس روپے میں تو آرٹی فیشل ٹوپس بھی نہیں آتے۔'' لو جی۔ آدھی چمنا تک دال کا حلوہ کھلا کر شاید یہ ہم سے کسی جاگیر ملنے کی توقع کر رہی تھیں۔ ویسے ان کو شوق ہے کوکنگ کا۔

ایک بار انہوں نے بہت محنت سے گلاب جامنیں بنائیں۔ بہت اچھی تھیں ہم نے نقد انعام حوصلہ افزائی کے طور پر ان کے حسب منشا پیش کیا۔ چند اور رشتے دار بھی موجود تھے۔ سب نے ایک ایک گلاب جامن کھا کر سو سو روپے انعام میں دیئے۔ اسی وقت ان کا بھائی کالج سے آ گیا خوش ہو کر آگے بڑھا ''اوہو گلاب جامن۔'' فوراً آگے بڑھیں۔ ''بھائی جان۔ سو روپے نکالیں۔ ایک گلاب جامن کے بھی ریٹ ہیں۔ پوچھ لیں۔'' بھی کبھی ڈان میں کالم لکھتی ہیں اسپورٹس کے بارے میں۔ چونکہ سب سے چھوٹی بھانجی ہیں۔ لہٰذا ہم پر واجب ہے ان کی قدر کریں عزت کریں۔ پچھلی بار ہم کراچی گئے۔ تو ایک سوٹ کے علاوہ چھوٹی موٹی ایک دو چیزیں اور ایک شادی میں نکاح میں ملنے والی دو میوے کی تھیلیاں بھی رکھ دیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا۔ سماج کی دیوار کی طرح محترمہ عیشہ صاحبہ موجود ہیں۔ فوراً معترض ہوئیں۔ ''خالہ جان۔ بیاکے لئے بھر بھر کے تھیلے لاتی ہیں۔ میں آپ کو نظر نہیں آتی۔'' یہ نمبر 3 بھانجی کی وہی بیٹی ہیں۔ جن کو سوال کرنے کی عادت ہے۔ ہمیں شرمندہ کر دیا۔ مگر ہم بھی ان کی ماما کی خالہ جان ہیں۔ اپنی جان پر قرض رکھنا ہمیں پسند نہیں۔ واپس آ کر ہم نے ان کے مطابق چند چیزیں لے کر پارسل تہ کے بچے پر روانہ کیا۔ تہ وہ پارسل لے کر ان کے پاس آئیں۔ خوشی خوشی انہوں نے پارسل کھولا۔ ان کے بھائی نے دیکھا۔ تو فوراً بولا۔ ''تہ۔ عیشہ کے لئے ساری چیزیں۔ میرے لئے کچھ نہیں۔'' آخر بھائی کس کا ہے۔ تہ نے وضاحت کی۔ میں کچھ نہیں لائی۔ خالہ جان نے بھیجی ہیں۔ خالہ جان کو وہ خالو جان سمجھا فوراً کلفٹن فون ملایا۔ ''خالو جان۔ آپ نے عیشہ کے لئے پارسل بھیجا۔ مجھے کچھ نہیں۔ کئی۔'' اب خالو جان حیران۔ یہ ابھی ماں کے پیٹا بیٹی تو ہیں۔ جو ایک بار نمبر 4 کی سالگرہ سے چند دن پہلے ہم نے انہیں دو سو روپے دیئے۔ کہ اپنی مرضی سے کچھ لے لینا۔ وہاں ان بچوں کی اماں جان موجود تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''اچھا۔ ہمارے سامنے ان بھانجی کو سلامی پیش کی جا رہی ہے۔ اور ہم؟'' ہم نے ان کو سو روپے دیئے۔ ''لئے بیٹے۔ چھوٹی کو دو سو اور بڑی کو صرف سو۔ یہ کیا ناانصافی ہے۔'' ''بھئی۔ ان کی سالگرہ آنے والی ہے۔''

''ہماری بھی آنے والی ہے اگلے سال۔'' ان کا منہ بند رکھنا بہت مشکل ہے۔ بیٹے کے کارنامے بھی کم نہیں۔ بیٹھنا وہ جانتا تھا۔ ایک بار ایک مرغے کے پیچھے پڑ گیا۔ آگے آگے ٹانگیں اچھالتا مرغا پیچھے یہ دوڑ رہے ہیں۔ گھنٹہ ہو گیا۔ ہم نے کہا۔ ''بھئی اسے روکو۔ تھک جائے گا۔ رات کو ٹانگوں میں درد ہوگا۔ بچہ ہے آخر۔''

''اسے کچھ نہیں ہوگا۔ مرغا ہی تھک کر مر جائے گا۔'' یہ جواب ملا۔ ایک بار مارے شوق کے ان کی خالہ نے مرغی کے نیچے انڈے بٹھائے۔ چھبیس دن بعد چوزے نکل آتے ہیں۔ مگر چھ دن بعد ہی اس بچے نے مرغی کے شور و غل کے باوجود کئی انڈے نکالے اور توڑ توڑ کر دیکھا۔ پھر اعلان کیا۔ کوئی بچہ نہیں ہے۔ انڈے گندے ہو گئے ہیں کالے کالے اندر سے۔

بمشکل انہیں سمجھایا گیا۔ کہ ابھی نہیں۔ بچے بعد میں نکلیں گے۔ مگر ذوق تحقیق کا بھلا ہو۔ سب کی آنکھ بچا کر پھر چھ سات انڈے نکالے۔ کسی نے دیکھا اور ٹوکا تو پتہ چلا۔ انڈوں پر گندگی لگی ہوئی ہے۔ دھو کر پھر رکھ دیئے۔ اب نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ جو چند بلکہ شاید تین انڈے ہی ان کی دستبرد سے بچے تھے۔ اس میں چوزے نکل آئے۔ اس کے بعد۔۔۔ نہ جانے ان بچوں کا کیا بنا۔ (مرغی کے) زمانہ بہت تیز رفتار ہے۔ بچوں کی معلومات ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ٹی وی۔ کمپیوٹر نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی ہوئی ہے۔ کمپیوٹر اس دور کی ضرورت بھی ہے۔

مگر اس کا بے جا استعمال نقصان دہ بھی ہے۔ شکر ہے ابھی تک ہمارے گھرانے کے بچوں نے اس سے تعلیم حاصل کرنے کی ہی کوشش کی ہے۔ تربیت کے لئے۔ گھر کا ماحول ہی بہتر استاد ہوتا ہے۔

جہاں امن ہو۔ یکجہتی ہو۔ محبت خلوص ہمدردی اور رواداری ہو۔ بچپن سے ذہنوں میں نقش ہو جائے۔ پھر بچڑنے کے مواقع کم ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆